طنز و مزاح

مُسکرائیے
کیونکہ آپ زندہ ہیں

محمد نواز ساحر

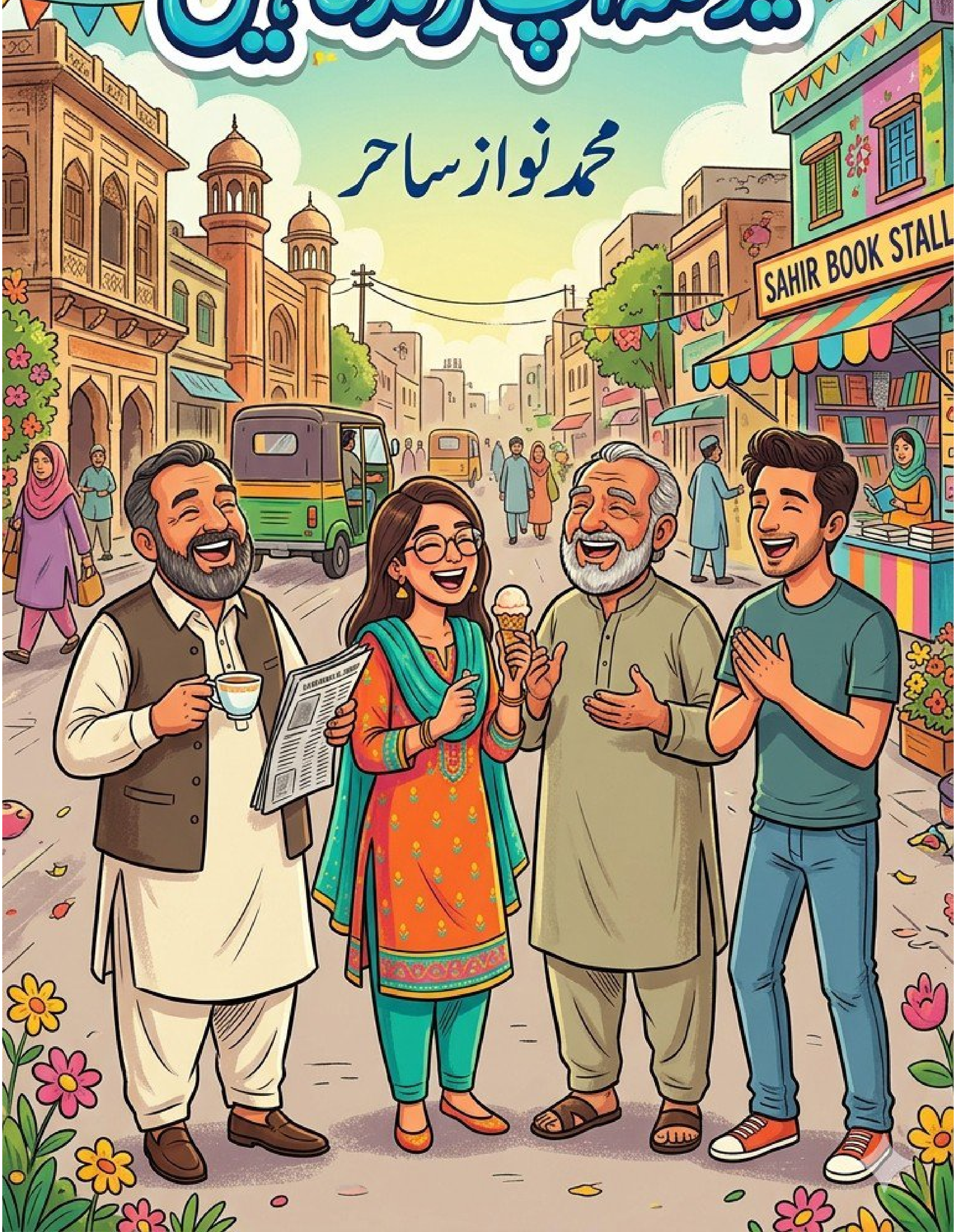

پیاسا کوّا

پ...

اب تک پیاسے کوّے کی جو کہانی آپ نے سنی ہے وہ ادھوری اور بے ڈھنگی ہے تو پیش خدمت ہے جدت آمیز پیاسہ کوّا۔

ایک کوّا تھا وہ بلکل پیاسہ نہیں تھا ہمیشہ اپنے پاس پانی کی بوتل رکھتا تھا۔

ایک دفعہ وہ بحیرہ عرب سے گزر رہا تھا کہ اس کی پانی والی بوتل سمندر میں گر گئی اور ڈوب گئی۔

ویسے آپ سوچ رہے ہوں گے کہ پلاسٹک کی بوتل کیسے ڈوب سکتی ہے تو جناب آپ غلط سوچ رہے ہیں وہ شیشے والی بوتل تھی اس لیے اسے ڈوبنے دیجیے۔

پلاسٹک کی بوتلیں تو صرف انسان سمندر میں پھینکتے ہیں اور وہ بے چارہ انسان تھوڑی تھا۔

اب دوبارہ کوّے کی جانب آتے ہیں۔ کوّا ہمیشہ اپنا واٹر لیول کم نہیں ہونے دیتا تھا اسی لیے اس کی رنگت دوسرے کوووں سے کم کالی تھی۔

اس نے سوچا کہ پانی ساتھ رکھنا ضروری ہے تو اس لیے اس نے چونچ میں پانی بھر لیا اور پھر سے اڑنے لگا۔

اب اس کا گزر ایک صحرا سے ہوا ریت میں موجود ایک کمینے سانپ نے اسے بلند آواز میں لطیفہ سنایا تو اس کوّے کی ہنسی چھوٹ گئی۔

اس کی چونچ سے سارا پانی گر گیا اور اب ہو گیا پیاسہ کوّا۔

مناسب وقت پر پانی نہ ملنے کی وجہ سے اس کی رنگت خراب ہو سکتی تھی اور اس کے چہرے کی رعنائی متاثر ہو سکتی تھی۔

اب وہ پانی کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔

وہاں سے گزرتے اس نے نیچے صحرا میں سسی اور پنوں کو روتے ہوئے دیکھا جو کہ آہستہ آہستہ بھاگے جا رہے تھے۔

ان کے سچے پیار کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہونے والے تھے مگر اس نے خود کو سنبھال لیا کیونکہ وہ جسم سے مزید پانی خارج نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے وہاں سے اپنی راہ لی۔

اڑتے اڑتے وہ کھجوروں کے ایک باغ میں پہنچا۔ یہ باغ ایک عربی شیخ کا تھا۔

صحرا میں کھجوروں کا باغ اور باغ میں ایک عربی شیخ مطلب اسے وہاں سے بھی پانی نہ ملا۔

پھر اچانک اس کی نظر کھجور کے پاس پڑے مٹکے پر پڑی اس نے پاس جا کر دیکھا اس میں کچھ بھی نہیں تھا مگر پاس ہی تھوڑی سی جگہ پر جھیل نما گھڑا نظر آیا جہاں پانی چمک رہا تھا۔

کوّے نے جاتے ہی اس میں چونچ ڈبو دی اور سیر ہو کر پانی پیا۔

ابھی وہ اڑنے ہی والا تھا کہ اس کے زہن میں خیال آیا یہ پانی آخر کہاں سے آ گیا حالانکہ یہاں تو اس کا ہونا ناممکن ہے۔

پھر اسے پاس ہی سے اونٹ کی آواز سنائی دی۔ اس اونٹ کی ٹانگیں گیلی تھیں۔

اب کوّا سمجھ گیا تھا کہ اس نے کیا پیا ہے اور اسے اپنے منہ میں کڑواہٹ بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

خیر وہ وہاں سے اڑا اور ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ سمندر کے کنارے پر پہنچ گیا۔

وہ کنارے پر پہنچ کر کہانی کے لکھاری کو کوسنے لگا کہ کاش تھوڑا اور اڑاتا رہتا تو شاید میں سمندر پر پہنچ کر تازہ پانی پیتا اور اس باغ میں وہ سب کچھ نہ پینا پڑتا۔

خیر یہ تھی اصل کہانی اور جو آپ پڑھتے ہیں وہ دراصل کوّے کی شکایت کے بعد بدل دی گئی تھی۔

ساس اور بہو کا جھگڑا

ساس اور بہو کا جھگڑا صدیوں سے چلا آرہا ہے اور بلکل ایک ہی رفتار سے چلا آرہا ہے۔

لاکھوں فلمیں ڈرامے صرف اسی جھگڑے کی وجہ سے زندہ تابندہ ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ وہی ساس جو اپنی بہو کی سانسوں پر بھی پابندی لگانا چاہتی ہے وہ ڈرامے میں ساس کا ظلم دیکھ کر اشکبار ہو جاتی ہے۔

اور اس سے بھی حیران کن بات یہ کہ اکثر بہویں جو کہ اپنی ساسوں کو گھروں سے نکال چکی ہوتی ہیں وہ ڈرامے میں بہو کی بدتمیزی دیکھ کر خون کے آنسو رونے لگتی ہیں اور اکثر اوقات تو اس بدتمیز بہو کے لیے زبان سے قابلِ داد جملوں کا اخراج بھی کرتی ہیں۔

اس دوغلے پن پر تو شاید شیطان بھی غلط فہمی کا شکار ہو جائے کہ ڈرامہ ٹیلی ویژن کے اندر چل رہا ہے یا ٹیلی ویژن کے باہر۔

آخر یہ جھگڑا ختم کیوں نہیں ہو جاتا؟

کیا اس کرہ ارض پر انسانوں کی بقاء کے لیے اس جھگڑے کا ہونا ضروری ہے؟

اس جھگڑے کے ختم ہونے سے کہیں گھر کی رونقیں تو نہیں بکھر جائیں گی؟

کیا یہ جھگڑا حقیقت میں محبت ہے؟

کیا لفظ ساس اور بہو کو ختم کر کے نئے الفاظ رائج کرنے سے جھگڑے میں افاقہ ہو سکتا ہے؟

یہ سب وہ سوالات ہیں جو ہم سب کے ذہنوں میں گردش نہیں کرتے۔

کیونکہ اگر یہ سوال ہمارے ذہن میں ہچکولے کھا رہے ہوتے تو شاید ہم اس اہم ترین مسئلے کا حل سوچتے۔

بڑی بڑی سلطنتیں وجود میں آئیں اور بڑے سے بڑے فساد کی جڑ کاٹی گئی مگر اس مسئلے کو آج تک حل نہیں کیا جاسکا۔

یہاں ایک اور فلسفہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ شاید بڑے بڑے حکمرانوں نے سلطنتیں اسی وجہ سے مطلب اسی جھگڑے کی وجہ سے قائم کی ہوں۔

آپ حیران ہو رہے ہیں کہ یہ کیسا بے ہودہ فلفسہ ہے۔

مگر ہم آپ پر ایک راز کھولتے ہیں۔

ذرا سوچیئے! بلکہ پورا سوچیے کہ ساس بہو کے اسی جھگڑے کی وجہ سے بادشاہ سلامت کو محل میں سکون نہیں ملتا ہو گا اور وہ اس روز روز کی چک چک سے تنگ آ کر جنگ کا ارادہ کر لیتے ہوں گے۔

اسی لیے تو وہ ایک جگہ رکتے ہی نہیں تھے بلکہ ایک بیوی کے پاس بھی نہیں رکتے تھے۔

اب ذرا قدرت کے اس نظام پر نظر ڈالتے جو ہزاروں برسوں سے ایک ہی ڈگر پر چلا آ رہا ہے۔

ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے اور پھر جوان ہوتی ہے۔

اس کی شادی ہوتی ہے اور وہ اس خاندان کا حصہ بن جاتی ہے جہاں ایک عدد ساس موجود ہوتی ہے۔

شادی سے پہلے وہ اس ایک عدد ساس کو آنٹی خالہ پھوپھو وغیرہ بلاتی ہے اور پھر شادی کے بعد بلاتی ہی نہیں۔

وہ ایک عدد ساس اپنے بیٹے کو بیوی کے ساتھ اکثر وقت بیتاتے ہوئے دیکھ لے تو اسے رن مرید، جورو کا غلام اور پتہ نہیں کیا کیا کہنا شروع کر دیتی ہے۔

حلانکہ اپنی بیٹی کے شوہر مطلب اپنے داماد کو بیوی کا خیال رکھنے والا تابعدار شوہر کہتی ہے۔

جبکہ اسے بھی تو رن مرید کہنا چاہیے۔

اسی طرح بہو سارا دن دوسری عورتوں کے ساتھ اپنی ساس کی برائیاں کرتی ہے اور صرف اپنے میکے کے گن گاتی رہتی ہے۔

جن میں سے صرف کچھ کا تذکرہ کرنا چاہوں گا:

1) میرے بھائی کی بہت اچھی نوکری ہے وہ ہوائی جہاز خرید سکتا ہے!

2) میرے والد محترم ہمیں سونے کے برتنوں میں کھانا کھلاتے تھے یہاں آ کر تو میں کمزور ہو گئی ہوں (حقیقت یہ ہے کہ سسرال میں آ کر وزن پچاس کلو سے پچھتر کلو ہو گیا ہوتا ہے)

3) میرے پڑوس میں فلانالڑکا رہتا تھا بہت ہی خوبصورت تھا مجھ پر جان نچھاور کرتا تھا اب اس کی اپنی فیکٹری ہے مگر میرے والدین نے مجھے اس فقیر کے لڑ لگا دیا (اب حقیقت کی طرف آئیں تو جس لڑکے کا ذکر کر رہی ہوتی ہیں وہ ہر لڑکی کے پیچھے رال ٹپکانے والا ہوتا ہے اور جس کو فیکٹری بتارہی ہوتی ہیں وہ اس کی قلفی والی دکان ہوتی ہے)

4) جب مَیں اپنے والدین کے گھر میں تھی ایک چیز کی خواہش کرتی تھی تو والد محترم دو چیزیں ساتھ اضافی لا کر دیتے تھے (حقیقت میں ایک چیز منگوانے کے لیے آنکھ اور ناک دونوں بہانے پڑتے ہوں گے)

دراصل میکے کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہیں کہ سسرال غریب خانہ لگے یا ایسا لگے کہ سسرالیے تو بھوکے ننگے ہیں۔

کوئی بھی بات کرنی ہو ساتھ میں لفظ "میرا" کا اضافہ لازمی کرتی ہیں۔

مثلاً میرا ابو میرا بھائی میرا چاچو میرا خالو میری بہن وغیرہ وغیرہ۔

اگر کوئی غلطی سے کہہ دے کہ میری انگلی ٹوٹ گئی تھی تو بتانے لگ جائیں گی کہ میرا تو ہاتھ ٹوٹ گیا تھا۔

مطلب ہر بات کو بڑھا چڑھا کر ہی پیش کرنا ہے جیسے ایسا کرنے سے انعام مل جائے گا۔

میرے خیال میں اگر لڑکی صرف اپنے میکے کا ذکر کم کر دے تو جھگڑے کا پتہ نہیں مگر سسرال میں اس کی عزت ضرور بڑھ جائے گی۔

اور جھگڑے کا واحد حل صرف یہی ہے کہ شادی شدہ جوڑے کو علیحدہ کر دیا جائے تا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکیں۔

اس طرح وہ والدین کی کفالت بھی کر سکیں گے اور عزت کے رشتے بھی برقرار رہیں گے۔

ورنہ علیحدہ تو وہ ہو جائیں گے چاہے انہیں لڑ کر ہی ہونا پڑے۔

مگر اس طرح سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔

عزت بھی اور کفالت بھی۔

ہائے غُربت

محمد صابر گاؤں کا ایک نہایت غریب شخص تھا۔ بیچارے کے صرف نو بچے تھے دسواں بے چارہ ٹھنڈ لگنے کی وجہ سے فوت ہو گیا تھا۔

محمد صابر بیچارہ مزدور... کہاں سے خرچے پورے کرتا اس لیے فقط صبر پر گزارا ہو رہا تھا مگر بے چارہ بچوں کے معاملے میں صبر نہ کر سکا۔

جب اس سے پوچھا تو پتہ چلا کہ اس میں صرف وہی اکیلا قصوروار نہیں تھا بلکہ اس کی خالہ نورین، چاچی فاطمہ المشہور فاطو اور اس کی ساس عابدہ کا بھی اچھا خاصہ حصہ تھا۔

وہ بتاتا ہے کہ دو چار بچے تو چاچی کے کہنے پر دو خالہ کے کہنے پر اور باقی ساسو ماں کے کہنے پر بڑھائے تھے۔

جب محمد صابر سے سوال کیا گیا کہ بھائی تُو انکار بھی تو کر سکتا تھا... تو وہ کہنے لگا کہ جو بھی آئی یہی کہتی تھی کہ صابر یہ اللہ کی دین ہے اور ہاں اگر یہ چار مر گئے تو تمھارا کیا ہو گا اس لیے دو اور کر لو... پھر کیا تھا کہ گھر میں ہر طرح کے سُر بکھرنے کا انتظام ہوتا گیا۔

ایک مرتبہ تو یوں ہوا کہ صابر نے دھوتی باندھی اور بازار میں سبزی لینے چلا گیا۔

اسکے پانچوں صاحبزادے وہاں دوکان کے پاس کھیل رہے تھے اپنے باپ کو آتا دیکھ کر پانچوں اس سے لپٹ گئے... ایک صاحبزادے نے اتنی زور سے دھوتی کو کھینچا کہ سرے بازار دھوتی ہوا میں لہراتی ہوئی زمین بوس ہو گئی اور یوں عزت نفس کی نیلامی ہو گئی۔

اس نے فوراً دھوتی کو سنبھالا اور پانچوں کو چماٹ لگاتا ہوا گھر کی جانب لے آیا... جب گھر پہنچا تو بیوی نے اس عین نوازش کی وجہ پوچھی۔

وہ ابھی بتانے ہی والا تھا کہ چھوٹی بیٹی نے باپ کو دیکھتے ہی کمرے کی چھت سے چھلانگ لگا دی۔

ماں نے اسے یوں گرے دیکھا تو گود میں بیٹھی بچی کا خیال نہ رہا جسے وہ

دودھ پلا رہی تھی۔

جلدی سے چارپائی سے اٹھ کر گری ہوئی بیٹی کی جانب لپکی تو گود والی دھڑم سے فرش پر گِر گئی اور اس کا بھی سر پھٹ گیا۔

پھر کیا ہونا تھا کہ وہ دونوں کو اٹھا کر ہسپتال کی جانب چل دیے۔

یوں ان کی زندگی خوشیوں سے بھرپور گزرتی رہی۔

ھائے گرمی

صبح سے ہی گرمی بہت زیادہ تھی۔

اتنی گرمی میں عاشق معشوق تو ایک طرف بلکہ پیار محبت کا بھی پسینہ نکل جائے!

شدید گرم موسم میں دل کو کہیں بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔

بجلی بھی محبوبہ کی طرح چھوڑ کر جا چکی تھی اور میرے پاس اس کی بے وفائی پر رونے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

ویسے بجلی آئے نہ آئے بل ہر دفعہ ایسے آتا ہے جیسے غریب کے گھر میں بھوک آتی ہے... مطلب ہمیشہ پہلے سے بڑھ کر!

کچھ دیر حکومت کو برا بھلا کہا اور پھر مَیں شیشہ پکڑ کر اپنے سفید بال کھینچنے لگا۔

تین چار اکھاڑنے کے بعد دل اکتاسا گیا کیونکہ تقریباً زیادہ تر بال سفید ہی تھے۔

اگر سارے نکال دیتا تو سر پر چاند نکل آنا تھا۔

پھر مجھے یاد آیا میری چوتھی جان کا نمبر میرے پاس ہے۔

مَیں اسے کال کر لیتا ہوں۔

مَیں نے اپنی محبوبہ کو کال ملالی۔

وہ پوچھنے لگی کہاں ہو؟

مَیں نے شوخا ہوتے ہوئے جواب دیا " تمھارے دل میں"

وہ فوراً بول اٹھی " گرمی بہت زیادہ ہے اتنی بھیڑ میں مر جاؤ گے جلدی سے باہر آجاؤ"

مشغلے

ویسے تو ہر شخص کا کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور ہوتا ہے جسے وہ فارغ وقت میں سر انجام دیتا ہے۔

جیسے:

1) کھانا کھانا،

2) واش روم میں بیٹھنا،

3) لڑکیوں کو تاڑنا۔

کھانا کھانا:

سب سے پہلے ہم ذکر کریں گے پہلے مشغلے کا جو کہ برصغیر پاک و ہند میں مقبول ترین مشغلہ ہے۔

اس مشغلے کو زیادہ تر شادی بیاہ یا دیگر تقریبات میں سر انجام دیا جاتا ہے۔
اس مشغلے کی رو سے ایک باری میں تین وقت کا کھانا کھالینا مناسب سمجھا جاتا ہے۔
اس مشغلے کو زیادہ دیر تک جاری نہیں رکھا جا سکتا ورنہ پیٹ پھٹنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

واش روم میں بیٹھنا:
ہر شخص روزانہ تقریباً دوبار واش روم کا رخ کرتا ہے مگر کچھ لوگ اس حاجت کو مشغلے سے کم نہیں سمجھتے۔
ایک دفعہ واش روم میں داخل ہو جائیں تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔
کھانے کے علاوہ کئی اہم امور بیٹھے بیٹھے سر انجام دے دیتے ہیں جیسا کہ سوچ و بچار کرنا، فون کالز کرنا، مسائل کا حل ڈھونڈنا۔
باہر انتظار میں کھڑے لوگوں کے بال سفید اور کپڑے گیلے ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔

لڑکیوں کو تاڑنا:

نوجوانوں میں مقبول ترین ہے۔

تنگ گلی میں کھڑے ہو کر ہر آتی جاتی دوشیزہ پر نظر جماتے ہیں۔

اکثر اسی گلی میں پکڑے جاتے ہیں اور اپنی تشریف رنگین کروانے سے باز نہیں آتے۔

اس مشغلے کو اپنانے والے نوجوان بہت محنتی ہوتے ہیں۔

صبح سویرے اٹھتے ہیں، لمبے بال سنوارتے ہیں، رنگین چشمہ پہنتے ہیں اور شام تک سرگرداں رہتے ہیں۔

اتنے محنتی ہونے کے باجود کوئی کام نہیں کرتے اور گھر والوں سے گالیوں کے تحفے وصول کرتے ہیں۔

کبوتر بازی

قاسم ہمارا بہت اچھا دوست تھا۔

ہمیشہ مسکراتے ہوئے ملتا تھا اور خوش دلی سے بات کرتا تھا مگر ایک دن اسے عجیب دورہ پڑا۔

وہ اٹھتے بیٹھتے آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔

پہلے تو ہمیں لگا کہ شاید وہ اڑتی ہوئی چیلوں کی گنتی کرتا ہے یا بادلوں پر بنے نقوش سمجھنے کی کوشش میں ہے۔

مگر ایک دن ہم نے دیکھا کہ نہ تو آسمان پر بادل ہیں اور نہ ہی چیلیں!

وہ پھر بھی آسمان کی طرف منہ کئے چھت پر لیٹا ہوا تھا۔

ہم نے اسے بلانے کی کوشش کی تو کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

اسے ہلا کر دیکھا تو جیسے کوما میں چلا گیا ہو۔
تشویش مذید بڑھ گئی کہ شاید فالج کا اٹیک ہو گیا ہے جبھی تو اتنی تیز دھوپ
میں چھت پر پڑا ہوا ہے۔

ہم ڈاکٹر کو کال کرنے ہی والے تھے کہ اس کی والدہ محترمہ نے بتایا کہ
موصوف نے چار کبوتر خرید لیے ہیں اور انہیں اڑا کر صبح و شام آسمان پر
ڈھونڈ تا رہتا ہے۔
تب ہمیں پتہ چلا کہ کبوتر رکھنا کوئی شوق نہیں ہے بلکہ انہیں اڑا کر دیکھتے
رہنا شوق ہے۔
اگر اڑتے ہوئے کبوتر دیکھنا عبادت ہوتا تو یہ لوگ ایک ہفتے میں جنت کے اعلیٰ
مقام پر فائز ہو جاتے۔

ان لوگوں کی نظر کمزور بھی ہو تو آسمان میں اڑتے ہوئے کبوتروں کو دیکھ
لیتے ہیں چاہے سامنے کھڑا آدمی بھی ان کو نظر نہ آئے۔
کبوتروں کی تعریف اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی عورت اپنے میکے کی

تعریف کرتی ہے۔

اگر بازی میں ان کا اڑایا ہوا کبوتر شام تک واپس نہ آئے تو ان کو ایسا صدمہ پہنچتا ہے جیسا شاید محبوب کے مرنے پر عاشق کو بھی نہ پہنچے۔

چار ہزار کی بازی لگاتے ہیں تو چالیس ہزار کی نوکری سے بھی چھٹی کر لیتے ہیں۔

عید کی نماز

عید کی نماز واحد نماز ہے جو سال بعد ادا کی جاتی ہے۔
اس لیے کئی مصروف مسلمان عمر بھر اسی نماز پر اکتفا کرنا پسند کرتے ہیں۔
یہ نماز آسان بھی ہے کیونکہ ساری نماز دوسروں کو دیکھ کر ادا کرلی جاتی ہے۔
شہروں میں زیادہ تر عورتیں گھروں میں نماز کا اہتمام کرتی ہیں جبکہ مرد عید گاہ کو روانہ ہو جاتے ہیں جبکہ دیہات میں عورتیں مردوں کے پیچھے نماز ادا کرلیتی ہیں۔
دیہات میں موجود کئی لونڈے لپاڑے جنہیں سال بھر کوئی لڑکی گھاس نہیں ڈالتی وہ مسجد کا رخ کرلیتے ہیں۔
انوکھے فیشن کے کپڑے پہنتے ہیں اور تیز پرفیوم کا چھڑکاؤ کرتے ہیں۔

سر پر ٹوپی لگا کر شیطان کو ٹوپی کروانے کے چکر میں ہوتے ہیں۔

دور سے ہی دیکھ کر پہچان لیے جاتے ہیں اور اس مبارک دن پر بھی اپنی تشریف سرخ کروانے سے باز نہیں آتے۔

کئی مفتی ٹائپ لوگ عید پر مولوی سے اپنی کثیر رقم محفوظ کر لیتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ یہ عید فرض نہیں ہے یہ تو نفلی عبادت ہے اس لیے پڑھو یا نہ پڑھو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

نماز کے بعد گلے ملتے وقت کئی لوگ اتنی تیزی دیکھاتے ہیں جیسے وہ گلے ملنے کا ورلڈ ریکارڈ قائم کرنا چاہتے ہوں۔

اور سب سے زیادہ جوش وخروش سے ملنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو سالانہ حاضری دینے آتے ہیں۔

نماز کے بعد دعا میں انگریزوں کو بد عادی جاتی ہے اور ان بھلے لوگوں کے حق میں دعا کی جاتی ہے جنہوں نے سالہا سال مسجد کی تعمیر و ترقی میں حصہ ڈالا

ہے۔

جو کہ امریکہ یا آسٹریلیا میں مقیم ہوتے ہیں۔

ادائیگی کے بعد عید مبارک عید مبارک کی نویدیں سنائی دیتی ہیں اور لوگ مسکراتے ہوئے گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں۔

کئی لوگ حسرت بھری نگاہوں سے مسجد کی جانب دیکھتے ہیں کہ ناجانے اگلے سال کیسی ہو گی۔

واپسی پر لوگ راستہ بدل لیتے ہیں جبکہ شہروں میں ایسا کرنا مشکل ہوتا ہے مگر دیہات میں لوگ ایسا کر ہی لیتے ہیں۔

خصوصاً نوجوانوں ویران بازار سے آتے ہیں اور جانے کے لیے اپنی نزدیکی محبوبہ کے گھر کا راستہ چنتے ہیں تا کہ دیکھا سکیں کہ تم نے جو سوٹ گفٹ کیا تھا میں نے وہی پہنا ہے۔